مسئلہ سود اور قرآن کریم

(۲)

(از جناب مولوی سید احمد قادری صاحب مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ)

سود اور فقہ حنفی

گزشتہ صفحات سے یہ امر بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ کتاب و سنت نے سود کو بغیر کسی قید کے حرام کیا ہے اور سود کی تحقیق کے لیے مال معصوم کی قید نہیں لگائی ہے۔ اب ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ ائمہ احناف رحمہم اللہ نے مسئلہ ربا کو کس طرح مرتب کیا ہے۔ راقم کا مقصود یہ نہیں ہے کہ ربا کے پورے باب پر بحث کرے بلکہ صرف اس جہت سے فقہ حنفی کی چھان بین مطمح نظر ہے کہ آیا فقہ حنفی میں بھی حرمت ربا اسی طرح مطلق اور غیر مشروط ہے جس طرح کتاب و سنت میں ہے یا فقہ حنفی میں اس کی حرمت مقید اور مشروط ہو گئی ہے۔ دوسری چیز یہ دیکھنی ہے کہ اگر فقہ حنفی میں حرمت ربا مقید ہو گئی ہے تو اس کی بنیاد اور دلائل کیا ہیں؟

فقہ حنفی اس فقہ کا نام ہے جو امام اعظم اور ان کے دو شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے اجتہادات و استنباطات سے مرتب ہوئی ہے۔ مسئلہ متنازعہ فیہ میں چونکہ امام ابو یوسف طرفین کے ساتھ نہیں ہیں اس لیے یہاں فقہ حنفی کا لفظ جب استعمال ہوگا تو اس سے مراد طرفین کی رائے ہوگی۔ فقہ حنفی میں امام محمد رحمہ اللہ کی کتابیں بنیاد اور اصل کی حیثیت رکھتی ہیں اور انہی کتابوں پر اس کا دارومدار ہے۔ بعد کو جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں سب کا ماخذ وہی کتابیں ہیں اس لیے راقم بھی جو کچھ لکھے گا اس کا زیادہ حصہ انہیں کتابوں سے ماخوذ ہوگا۔

سب سے پہلے ہمیں معلوم کر لینا چاہیے کہ فقہ حنفی میں ربا کی کیا تعریف کی گئی ہے۔ امام سرخسی فرماتے ہیں۔

وفی الشریعۃ الربا ھو الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع۔ (مبسوط ج ۱۲ ص ۱۰۹)	شریعت میں ربا اس زیادتی خالی اور بیع میں مشروط ہو۔

اس تعریف میں بدلین (بائع و مشتری میں جن چیزوں کا تبادلہ ہوتا ہے ان کو بدلین کہتے ہیں) کے معصوم ہونے کی کوئی شرط لگی ہوئی نہیں ہے۔ اس لیے ہر اس زیادتی کو سود کہیں گے جو عوض سے خالی اور بیع میں مشروط ہو، چاہے یہ خرید و فروخت مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو یا مسلمان اور حربی کے درمیان۔ تعریف کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ ربا کے متعلق ائمہ احناف کی رائے کیا ہے۔

امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ ربا ان اشخاص کے درمیان حرام ہے جو مسلمان ہوں یا اسلامی حکومت کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہے ہوں۔ حکومت اسلامیہ کے دائرے میں بسنے والے تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمان، ذمی، مستامن۔ ربا ان ہی تین قسم کے لوگوں کے درمیان حرام ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان اسلامی دائرۂ حکومت سے نکل کر دار الحرب میں حکومت کافرہ سے امن و امان لے کر داخل ہو تو اس مسلمان اور حربیوں کے درمیان نہ صرف یہ کہ ربا جائز ہے بلکہ تمام عقود فاسدہ جائز ہیں۔ اس مسلمان پر بس اتنی ہی پابندی ہے کہ حربیوں سے غدر و بے وفائی نہ کرے اور ان کے قانون کا پابند رہے۔ اس کے علاوہ ان کی رضامندی سے جس طرح بھی ممکن ہو وہ ان کے اموال حاصل کر سکتا ہے اور وہ حاصل کردہ اموال اس کے لیے حلال و طیب ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی حربی بغیر امان دار الاسلام میں داخل ہو تو اس سے تمام عقود فاسدہ درست ہیں۔ غرض یہ کہ حربی سے بطیب خاطر اس کے اموال کی تحصیل جائز ہے چاہے جیسے بھی ممکن ہو۔ امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کی اس رائے اور خیال کے موافق عبارتیں کتب ظاہر الروایۃ میں بھری پڑی ہیں۔ یہی وہ خیال ہے جس کو کرات و مرات دہرایا گیا ہے اور یہی وہ خیال ہے جس پر دلائل قائم کیے گئے ہیں جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ کہیں کہیں ایک دوسرا خیال بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم و حربی کے درمیان ربا کا جو معاملہ ہوگا وہ معاملہ ہونے کی حیثیت سے باطل اور حرام ہوگا لیکن اس مسلمان کے قبضے میں جو مال آئے گا وہ اس کے لیے حلال و طیب ہوگا۔ مثلاً ایک مسلمان نے ایک حربی سے کہا کہ میں ایک روپے کو دو روپے کے بدلے میں بیچتا ہوں۔ اس حربی نے اس بیع کو قبول کیا اور

سالے حوالہ کیے تو بیع کا یہ معاملہ حرام ہونے کی وجہ سے باطل ہو گیا لیکن دو روپے جو اس مسلمان کی جیب میں گئے وہ اس کے لیے حلال وطیب ہیں۔ یہ خیال پہلے خیال کے مقابلہ میں کم ظاہر کیا گیا ہے اور اس پر کوئی دلیل بھی قائم نہیں کی گئی ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ کی کتابوں میں مسلم و حربی کے درمیان معاملہ ربا یا دیگر عقود فاسدہ کے متعلق یہی دو خیال پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا خیال ان کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ اب میں علی الترتیب ان دو خیالوں کے متعلق عبارتیں پیش کرتا ہوں۔

وإذا دخل المسلم دار الحرب	اور جب مسلمان دار الحرب میں امان لے کر داخل ہو تو
بأمان فلا بأس بأن يأخذ منهم أموالهم	اس کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے اموال ان کی
بطيب أنفسهم بأي وجه كان	رضامندی سے جس طرح بھی چاہے حاصل کرے۔

امام سرخسی امام محمد کی عبارت مذکورہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لأن أموالهم لا تصير معصومة	اس لیے کہ اہل حرب کے اموال امان لے کر مسلمان کے ان کے پاس
بدخوله إليهم بأمان ولكنه ضمن	داخل ہو جانے سے معصوم نہیں ہو جاتے۔ اس پر عقد امان
بعقد الأمان أن لا يخونهم فعليه التحرز	کی وجہ سے اس کی ذمہ داری ہے کہ خیانت نہ کرے پس
عن الخيانة وبأي سبب طيب أنفسهم	اس پر واجب ہے کہ خیانت سے بچے، وہ ان سے مال لیتے
حين أخذ المال فإنما أخذ المباح على	وقت جس سبب سے بھی خوشنودی حاصل کرے گا تو یہ شخص
وجه منعه عن الغدر فيكون ذلك	مباح مال کو ایسے طریقے سے لے گا جس میں خیانت نہیں
طيبا له الأسير والمستأمن في ذلك	لہذا یہ مال اس کے لیے طیب ہوگا، قیدی اور مستامن
سواء حتى لو باعهم درهما بدرهمين	اس میں برابر ہیں یہاں تک کہ اگر یہ ان سے ایک درہم
أو باعهم ميتة بدراهم أو أخذ مالا	کو دو درہم کے بدلے میں بیچے یا ان سے مردار کو دراہم
منهم بطريق القمار فذلك كله طيب	کے عوض بیچے یا ان سے بطریق قمار مال حاصل کرے تو یہ
وهذا كله قول أبي حنيفة ومحمد	سب کچھ اس کے لیے طیب ہے اور یہ کل باتیں ابو حنیفہ
رضي الله عنهما (شرح سیر کبیر ج ۲ ص [illegible])	اور محمد رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

یہ عبارت مسئلہ مبحوث عنہا میں طرفین کے مسلک کو پوری وضاحت کے س
آگے چل کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے معاملہ کو دلیل بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

فتبین انہ یجوز عقد الربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب (شرح سیر کبیرہ ج ۴ ص [illegible])

پس یہ بات کھل گئی کہ مسلمان اور حربی کے درمیان دار الحرب میں سود کا معاملہ جائز ہے۔

یہ عبارت صاف طور سے بتا رہی ہے کہ حربی کا مال نہ صرف یہ کہ بطریق ربا لینا جائز ہے بلکہ خود عقد ربا بھی اس سے جائز ہے۔

وقد بینا ان الربا یجوز بین المسلم والحربی فی دار الحرب (شرح سیر کبیر ج ۳ ص [illegible])

اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود جائز ہے۔

امام ابو جعفر طحاوی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے معاملہ ربا کو دلیل بناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ففی ذلک ما قد دل ان الربا کان حلالا فیما بین المسلمین وبین المشرکین بمکۃ لما کانت دار حرب وھو حینئذ حرام بین المسلمین فی دار الاسلام وفی ذلک ما قد دل علی اباحۃ الربا بین المسلمین وبین اھل الحرب فی دار الحرب کما یقول ابو حنیفہ والثوری۔

قال محمد وھو قولنا

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ سود مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان حلال تھا جبکہ مکہ دار الحرب تھا حالانکہ سود اس وقت دار الاسلام میں مسلمانوں کے درمیان حرام تھا اور اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ سود مسلمانوں اور حربیوں کے درمیان دار الحرب میں مباح ہے جیسا کہ ابو حنیفہ اور ثوری کہتے ہیں۔ محمد نے کہا یہی ہمارا قول ہے۔

یہ عبارت اس بات پر تصریح ہے کہ امام ابو یوسف کے سوا دیگر ائمہ احناف کے نزدیک ربا کی حرمت مقید ہے دار الاسلام کے ساتھ اور اس بات پر بھی تصریح ہے کہ وہ ربا کو دار الحرب میں حلال و مباح سمجھتے ہیں ـــــ یہ تفصیل تو اس صورت کی تھی کہ مسلمان دار الحرب میں مستامن بن کر جائے اب اس کو بھی دیکھ لینا چاہیے کہ حربی اگر بے امان کے دار الاسلام میں آجائے تو اس حربی سے بھی وہ تمام معاملات

کیے جاسکتے ہیں جو دار الحرب میں رہنے والے حربی سے جائز ہیں۔

ولو عسکر امن اهل الحرب لهم منعة دخلوا دار الاسلام ثم لمسلم من اليهم مسلم وعاملهم بهذه المعاملة التي لا تجوز فيما بين المسلمين فلا باس بذلك (شرح سیر کبیر ج ۳، ص ۲۲۹)

اور اگر حربیوں کا کوئی لشکر جس کو قوت و طاقت حاصل ہو دار الاسلام میں داخل ہو پھر ان سے امان لے کر کوئی مسلمان ان کے پاس جائے اور ایسا معاملہ کرے جو مسلمانوں کے درمیان ناجائز ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مبسوط میں ہے:

هذا يجوز بين المسلم والحربي الذي لا امان له سواء كان في دار الاسلام او في دار الحرب (مبسوط، ج ۱۴، ص ۵۷)

یہ معاملہ مسلمان اور اس حربی کے درمیان جس کو امان حاصل نہیں جائز ہے عام ازیں کہ وہ حربی دار الاسلام میں ہو یا دار الحرب میں۔

یہ اور اس قسم کی بکثرت عبارتیں کتب ظاہر الروایہ نیز دیگر ائمہ فقہ کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں جن سے بلاشبہہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام اعظم و امام محمد رحمہما اللہ مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا کے قائل ہیں۔ اتنی تفصیل راقم نے اس لیے پیش کی ہے کہ آجکل کے بعض مشہور اہل علم بزرگوں نے یہ لکھنا شروع کیا ہے کہ امام اعظم کی طرف جواز ربا کا انتساب بہتان ہے۔ اب دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ اگر یہ بہتان ہے تو اس بہتان تراشی کا مجرم کون ہے؟ کیا امام محمد، امام طحاوی، امام سرخسی سب کے سب اپنے امام اعظم پر بہتان لگا رہے ہیں؟ اس تفصیل کے بعد اب دوسرے خیال کی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔ امام ابو یوسف کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

هذا اخذ مال الكافر بطيبة نفسه ومعنى هذا ان اموالهم على اصل الاباحة الا انه ضمن ان لا يخونهم فهو يسترضيهم بهذا الاسباب للتحرز عن

یہ کافر کے مال کو اس کی خوشی سے لینا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اموال اصلاً مباح ہیں بس صرف یہ کہ وہ اس کا ضامن ہے کہ ان کی خیانت نہ کرے پس وہ اس اسباب کے ذریعہ ان کو راضی کرتا ہے تاکہ عہد و خیانت

الغدر، ثم یاخذ اموالهم باصل الاباحة باعتبار العقد وبه فارق المستامنین فی دارنا لان اموالهم صارت معصومة بعقد الامان فلا یمکنه اخذها بحکم الاباحة والاخذ بهذه العقود الباطلة حرام (مبسوط ج ۱۰، ص ۹۵)

سے بچے اس کے بعد وہ ان کے اموال کو اصل اباحت کی بنا پر لیتا ہے نہ کہ باعتبار عقد، اور اسی سے دارالاسلام کے مستامن اور دارالحرب کے حربی کے درمیان فرق ظاہر ہوگیا کیونکہ دارالاسلام کے مستامنوں کے اموال عقد امان کی وجہ سے معصوم ہوگئے ہیں لہذا ان کے اموال کو اصل اباحت کی بنا پر لینا ممکن نہیں ہے باقی رہا ان عقود باطلہ کے ذریعہ مال کا اخذ تو وہ حرام ہے۔

اسی بات کو امام سرخسی پھر دہراتے ہیں:

وهذا لان مال الحربی مباح فهو یتحرز عن الغدر بهذه الاسباب ثم یتملك المال علیهم بالاخذ لا بهذه الاسباب (مبسوط، ج ۱۴، ص ۵۷)

اور یہ اس لیے کہ حربی کا مال مباح ہے پس وہ ان اسباب کے ذریعہ غدر سے احتراز کرتا ہے پھر ان کے اموال کا مالک اخذ سے ہوتا ہے ان اسباب کے ذریعہ نہیں۔

یہ خیال پہلے خیال سے متناقض ہے کیونکہ پہلے بالفاظ صریح عقد ربا کو جائز کہا گیا ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ سے باہر ہے کہ صرف "اخذ" سے تملک کا قول کیا جائے۔ صرف اخذ سے تملک اس وقت ہوتا ہے جب یہ عقود جانبین میں نہ ہوتے۔ جب یہ عقود اس "اخذ" کے اسباب بن رہے ہیں تو پھر محض "اخذ" سے تملک کا قول بعید از فہم ہے۔

ایک تیسرا خیال یہ دو خیال تو وہ تھے جو کتب ظاہر الروایہ میں موجود ہیں لیکن امام محمد رحمہ اللہ کے بعد مسلم و حربی کے درمیان معاملہ ربا کے متعلق ہمارے بعض اہل فقہا کو ایک تیسرا خیال یہ پیدا ہوا کہ مسلم و حربی کے درمیان ربا، ربا ہی نہیں ہے اس لیے کہ تحقق ربا کے لیے بدلین کا معصوم ہونا شرط ہے اور اس صورت میں حربی کا بدل غیر معصوم ہے لہذا ربا غیر متحقق ہے۔ ملک العلماء کاسانی جریان ربا کے شرائط تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ومنها ان یکون البدلان معصومین

شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بدلین معصوم ہوں

فان کان احدھما غیر معصوم لا یتحقق الربا عندنا وعند ابی یوسف ھذا لیس بشرط ویتحقق الربا۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۹۲)

پس اگر ان دونوں میں سے کوئی غیر معصوم ہو تو ہمارے نزدیک ربا کا تحقق نہیں ہوگا اور ابو یوسف کے نزدیک یہ شرط درست نہیں اور ان کے نزدیک ربا کا تحقق ہو جائے گا۔

گزشتہ صفحات میں قرآن کریم، احادیث نبوی اور کتب ظاہر الروایہ سے ربا کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس میں تحقق ربا کے لیے کہیں یہ شرط نہیں پائی جاتی۔ ملک العلماء نے اس شرط کو اضافہ کر کے نہ صرف یہ کہ ربا کے متعلق قرآن و حدیث اور جاہلیت عرب کے اطلاقات کو بے معنی کر دیا ہے بلکہ امام محمد رحمہ اللہ کی تفصیلات اور ان کے دلائل کو بھی بے کار بنا دیا ہے اگر طرفین کے نزدیک بغیر اس شرط کے ربا کا تحقق نہ ہوتا تو اتنی بحث و جرح ہی کیوں ہوتی۔ وہ لوگ تو مسلم و حربی کے درمیان اخذ تو خیر اخذ ہی ہے عقد ربا کو جائز کہہ رہے ہیں وہ لوگ تو بقول امام طحاوی ربا کو دار الہجرت میں حرام اور دار الحرب میں حلال کہہ رہے ہیں وہ لوگ تو جواز ربا پر دلیلیں قائم کر رہے ہیں اگر تحقق ربا کے لیے اس شرط کا پایا جانا ضروری ہوتا تو امام محمد رحمہ اللہ کو صرف یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ مسلم و حربی کے درمیان ربا، ربا ہی نہیں رہتا بس ساری بحث ختم ہو جاتی، ملک العلماء نے نیک نیتی سے مسلک حنفی کو اعتراض سے بچانے کے لیے اس شرط کا اضافہ کیا ہوگا لیکن بجائے اس کے کہ اس شرط سے اعتراض دفع ہوتا اس نے اعتراض کو اور قوی کر دیا ہے اس کے علاوہ اس شرط کے اضافہ نے خود امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے ارشادات اور کتب ظاہر الروایہ کی عبارتوں کو فضول اور بے کار کر دیا ہے۔ اگر تحقق ربا کے لیے اس شرط کو مان لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ جاہلیت کے ربا کو ربا کہنا صحیح نہیں اور ہجرت نبوی سے پہلے عرب میں کبھی ربا کا تحقق نہیں ہوا اور آج بھی اسلامی حکومتوں کے دائرے سے باہر دنیا میں کہیں ربا کا وجود نہیں کیونکہ عصمت جان و مال کی تین ہی صورتیں ہیں۔ اسلام، عہد ذمہ، عہد استیمان۔ جو لوگ نہ مسلمان ہیں، نہ ذمی ہیں اور نہ مستامن ہیں ان کے نفوس و اموال غیر معصوم ہیں، ان کے نفوس و اموال پر لفظ معصوم کا اطلاق ہی صحیح نہیں اس لحاظ سے اسلامی حکومتوں کے دائرے سے باہر جتنے غیر مسلم ہیں ان سب کے اموال غیر معصوم ہیں اور جب غیر معصوم ہیں تو وہاں ربا کا وجود کہاں اب غور فرمائیے کہ اس شرط کے اضافہ نے مسلک حنفی کو قوی کیا ہے یا اس کو غیر معقول بنایا ہے لہذا

یہ شرط کسی حیثیت سے صحیح نہیں اور کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل کی کامل مصداق ہے۔

پہلے خیال یعنی جواز ربا کے دلائل مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا پر ہمارے ائمہ فقہ نے جو دلیلیں قائم کی ہیں وقت آگیا ہے کہ ان کی تنقید کر لی جائے آیا واقعی نصوص شرعیہ میں کوئی ایسی نص یا کوئی ایسی چیز ہے جو اس جواز کے لیے دلیل بن سکے؟

(۱) ثم استدل علیہ بمخاطرۃ ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع اھل مکۃ فی غلبۃ الروم اھل فارس حتی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زدہ فی الخطر وابعد فی الاجل فلو لم یکن ذلک جائزاً لمعھم لما امر بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۲۱۵)

پھر اس پر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس شرط سے استدلال کیا جاتا ہے جو انھوں نے اہل مکہ سے اہل فارس پر اہل روم کے غلبہ کی پیشینگوئی پر لگائی تھی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا تھا کہ شرط کی رقم اور بڑھاؤ نیز مدت میں بھی اضافہ کر دو پس یہ اگر ان کے ساتھ جائز نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم نہ دیتے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اصول حدیث و روایت کے لحاظ سے یہ روایت اس لائق نہیں کہ اس کو کسی حکم شرعی کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ کسی حکم شرعی کے ثبوت کے لیے حدیث صحیح کی ضرورت ہے لیکن حیرت ہے کہ ایسے اہم مسئلہ کے استدلال میں ایسی ضعیف روایت پیش کی گئی ہے اور اگر اس روایت کو کسی درجہ میں مان بھی لیا جائے تو شرط کا یہ واقعہ تحریم قمار سے بہت پہلے کا ہے۔ تحریم قمار کی آیت ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ واقعہ ہجرت سے پانچ چھ سال پہلے کا ہے تو پھر تحریم قمار سے پہلے کے واقعہ کو استدلال میں پیش کرنا کس طرح صحیح ہوگا۔ اگر کوئی شخص دار الحرب میں شرب خمر کے جواز کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مکہ میں شرب خمر کو استدلال میں پیش کرے تو یہ استدلال صحیح ہوگا؟ تعجب ہے کہ ربا جیسے اہم ترین مسئلہ کے لیے اتنا نادرست استدلال کس طرح پیش کیا گیا ہے۔

(۲) واستدل بمصارعۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکانۃ حین کان بمکۃ ثلاث مرات

اور استدلال کیا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رکانہ کے درمیان کشتی سے جب آپ مکہ میں تھے یہ کشتی تین بار

فی کل مرۃ بثلث غنمہ ولو کان مکروھا ما فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم لما صرعہ فی المرۃ الثالثۃ قال ما وضع احد جنبی قط وما انت صرعتنی فرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الغنم علیہ

(شرح سیر کبیر ج ۴ ص ۱۰۹۰)

ہوئی تھی اور ہر بار اس کے غنم کے ایک تہائی پر ہوئی تھی اگر یہ ناجائز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے پھر جب آپ نے اس کو تیسری بچھاڑ تو اس نے کہا کسی شخص نے کبھی میری پیٹھ نہیں لگائی اور نہ تم نے مجھے پچھاڑا ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کا ریوڑ واپس کر دیا۔

یہ استدلال بھی ویسا ہی استدلال ہے جیسا پہلا، یہ روایت بھی اصول روایت و حدیث کے اعتبار سے ناقابل اعتبار اور مجروح ہے۔ یہ واقعہ بھی تحریم قمار سے پہلے کا ہے اس لیے اس سے استدلال صحیح نہیں۔ نفس واقعہ کے لحاظ سے بھی تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ میں شرط کا سرے سے کوئی قصہ ہی نہیں پیش آیا۔ اس روایت کے منتہی فن سیرت کے امام ابن اسحاق اور ابن ہشام ہیں، ان دونوں کے سوا متقدمین اہل سیر میں سے شاید کسی نے بھی اس واقعہ کو سیرت نبوی میں درج نہیں کیا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ فن سیرت کے یہ دونوں امام اس واقعہ کو کس طرح پیش کرتے ہیں۔ ابن ہشام ایک الگ فصل میں لکھتے ہیں:

قال ابن اسحاق وحدثنی ابی اسحٰق بن یسار قال کان رکانۃ بن عبد یزید بن ھاشم بن عبد المطلب بن عبد مناف اشد قریش فخلا یوما برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض شعاب مکۃ فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا رکانۃ الا تتقی اللہ وتقبل ما ادعوک الیہ قال انی لو اعلم ان الذی تقول حق لاتبعتک فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارایت ان صرعتک

ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے ابو اسحاق بن یسار نے روایت کی، رکانہ بن عبد یزید قریش کا پہلوان تھا، ایک دن مکہ کی بعض گھاٹیوں میں اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی میں ملاقات ہوئی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے رکانہ اللہ سے ڈرتا نہیں اور میں جس چیز کی دعوت دیتا ہوں اس کو قبول نہیں کرتا اس نے کہا اگر مجھے علم ہوتا کہ جو بات تم کہتے ہو حق ہے تو میں ضرور تمہاری پیروی کرتا آپ نے فرمایا تیرا کیا خیال ہے اگر میں تجھے پچھاڑ دوں تو تجھے علم ہو جائے گا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں حق ہے

اتعلم ان ما اقول حق قال نعم قال فقم
حتی اصارعك فقام الیه رکانة یصارعه
فلما بطش به رسول الله صلعم اضجعه
وهو لا یملك من نفسه شیئاً ثم قال عد
یا محمد فعاد فصرعه فقال یا محمد والله
ان هذا لعجب اتصرعنی فقال رسول الله
صلی الله علیه وسلم واعجب من ذلك
ان شئت ان اریكه ان اتقیت الله
واتبعت امری قال ما هو قال ادعو لك
هذه الشجرة التی تری فتاتینی قال ادعها
فدعاها فاقبلت حتی وقعت بین یدی
رسول الله صلعم قال فقال لها ارجعی
الی مكانك فرجعت الی مكانها قال
فذهب رکانة الی قومه فقال یا بنی
عبد مناف ساحروا بصاحبكم اهل
الارض فوالله ما رایت ساحرا منه قط
ثم اخبرهم بالذی رای والذی
صنع۔ (سیرت ابن ہشام ص ۲۵۸ مطبوعہ قندھار)

اس نے کہا ہاں، آپ نے کہا تو کھڑا ہوتا کہ میں تجھ سے کشتی لڑوں رکانہ آپ کی طرف بڑھا آپ نے جب اس کو پکڑا تو زمین پر لٹا دیا اور رکانہ بالکل بے قابو تھا اس نے کہا اے محمد دوبارہ۔ آپ نے دوسری بار بھی اس کو پچھاڑ دیا رکانہ نے کہا اے محمد بخدا یہ تعجب خیز بات ہے کیا تم نے مجھے پچھاڑا ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تو چاہے تو میں اس سے بھی زیادہ تعجب خیز شے دکھاؤں اگر تو خدا سے ڈرے اور میری پیروی کرے اس نے کہا وہ کیا چیز ہے آپ نے فرمایا میں اس درخت کو بلاؤں گا جس کو تو دیکھ رہا ہے پس وہ میرے پاس آجائے گا اس نے کہا بلاؤ۔ اس کو پکارا تو وہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا پھر آپ نے فرمایا اپنی جگہ پر واپس جا تو وہ واپس ہو گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ رکانہ اپنی قوم کے پاس گیا اور کہا کہ اے بنی عبد مناف تم محمد کے ساتھ تمام اہل زمین سے جادو میں مقابلہ کرو بخدا میں نے اس سے بڑا جادوگر کبھی نہیں دیکھا پھر اس نے جو دیکھا تھا اور اس کے ساتھ جو ہوا تھا ان کو بتایا۔ .....

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رکانہ کو دعوت اسلام پیش کی تھی اس دعوت کے جواب میں اس نے معجزہ طلب کیا اور طلب معجزہ کے جواب میں مصارعۃ کا واقعہ پیش آیا اور جب اس سے بھی مطمئن نہ ہوا تو درختوں کا معجزہ پیش کیا گیا لیکن وہ اس وقت اس کے بعد

بھی ایمان نہ لایا۔ اس واقعہ میں نہ تو غنم پر کسی شرط کا قصہ ہے اور نہ رد غنم کا کوئی ذکر، یہ مصارعۃ دعوت اسلام کے سلسلے میں پیش آئی یہاں شرط کا کیا ذکر۔ تحریم قمار سے پہلے ہی سہی لیکن کسی شرط پہ مصارعۃ کا انتساب ذات نبوی کے ساتھ دل قبول نہیں کرتا تھا بحمد اللہ کہ سیرت ابن ہشام کے مطالعہ نے یہ کھٹک بھی دور کر دی اب غور فرمائیے کہ اس واقعہ کو مسئلۂ مبحوث عنہا سے کسی طرح کا بھی کوئی لگاؤ ہے؟ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعہ کو غالباً ابن اسحٰق کی اصل کتاب سے باین الفاظ تحریر فرماتے ہیں:

"محمد بن اسحاق در کتاب خود آورده که در مکہ مردے بود رکانہ نام شدید القوۃ کہ در صنعت کشتی گری بے ہمتا و یگانہ بود مردم از بلاد برائے مصارعت وے می آمدند و ہمہ را بر زمین می افگندنا گاہ روزے در شعبے از شعاب مکہ بآں حضرت پیش آمد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم با وے گفت اے رکانہ از خدانمی ترسی وچرا دعوت مرا قبول نمی کنی رکانہ گفت اے محمد چیزے بیار کہ گواہی دہد بر صدق تو اگر کشتی گیرم و ترا بیندازم ایمان می آری گفت نعم فرمود آمادہ شو برائے کشتی پس آمادہ گشت رکانہ برائے کشتی و آنحضرت در جامہائے خود در دائے وازارے در بر داشت پس آمد نزدیک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بوے وبگرفت وبر زمین زد پس حیران و متعجب شد رکانہ در خواست از آنحضرت کہ رہا کند او را و باز کشتی گیرد بار دوم و سوم نیز بینداخت پس متعجب شد رکانہ گفت کہ شان تو عجیب است ہمیں سقدر آوردہ اند حدیث و بیان نہ کردہ اند کہ اسلام آورد یا نہ واللہ اعلم۔" (مدارج النبوۃ ج ۱ صفحہ ۲۸۲ مطبوعہ نول کشور)

حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں رکانہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے اور ان کا انتقال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا۔ بحمد اللہ کہ اس تفصیل سے یہ بات منقح ہو گئی کہ واقعۂ رکانہ کو اس مسئلہ سے کسی طرح کا لگاؤ ہی نہیں ہے۔

(۳) واستدل علیہ ایضاً بحدیث بنی قینقاع فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین اجلاھم قالوا ان لنا دیونا لم تحل	اور اس پر حدیث بنی قینقاع سے بھی استدلال کیا گیا ہے اس لیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جلا وطن کیا تو انھوں نے کہا کہ لوگوں کے ذمہ ہمارے قرض باقی

بعد فقال تعجلوا وضعوا ولما اجلى بنى النضير قالوا ان لناديونا على الناس فقال ضعوا وتعجلوا ومعلوم ان مثل هذا المعاملة لا يجوز بين المسلمين فان كان له على غيره دين الى اجل فوضع عنه بعضه بشرط ان يعجل بعضه لم يجز كره ذلك عمر وزيد بن ثابت وابن عمر رضى الله عنهم ثم جوز رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فى حقهم لانهم كانوا اهل حرب فى ذلك الوقت ولهذا اجلاهم فعرفنا انه يجوز بين الحربى والمسلم ما لا يجوز بين المسلمين

(شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۱۸۰)

ہیں اور ادا کا وقت ابھی نہیں آیا تو آپ نے فرمایا جلدی کرو اور وضع کرو اور جب آپ نے بنی نضیر کو جلا وطن کیا تو انھوں نے کہا لوگوں کے ذمہ ہمارے قرض باقی ہیں آپ نے فرمایا وضع کرو اور جلدی کرو اور یہ بات معلوم ہے کہ اس قسم کا معاملہ مسلمانوں کے درمیان جائز نہیں اس لیے کہ کسی کا کسی پر اگر دین ایک مقررہ مدت تک کے لیے ہو اور وہ اس میں سے کچھ اس شرط پر کم کر دے کہ بقیہ حصہ جلدی سے ادا کر دیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے اس کو ناجائز سمجھا ہے عمر و زید بن ثابت و ابن عمر رضی اللہ عنہم نے پھر اس کو جائز قرار دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں اس لیے کہ وہ اس وقت حربی تھے اور اسی لیے ان کو جلا وطن کیا پس ہم نے سمجھا کہ حربی اور مسلم کے درمیان وہ چیز جائز ہے جو مسلمانوں

بنی قینقاع کو با تفاق محدثین و اہل سیر غزوۂ بدر کے بعد ۲ھ میں جلا وطن کیا گیا ہے اور تحریم ربا کی پہلی آیت غزوۂ احد کے بعد ۳ھ میں نازل ہوئی ہے اس لیے بنی قینقاع کے واقعہ کو استدلال میں پیش کرنا صحیح نہیں۔ بنی نضیر کے اجلا کے متعلق دو رائیں ہیں امام بخاری و امام سہیلی کی رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ احد سے پہلے ہوا اور دیگر جمہور اہل سیر کی رائے یہ ہے کہ غزوہ احد کے بعد ۴ھ میں ہوا۔ راقم اس آخری رائے کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی گزارشیں پیش کرتا ہے۔

(۱) وضع دین کا جواز و عدم جواز صحابہ کرام اور تابعین کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے جن حضرات کے نزدیک یہ ناجائز ہے تو ہر جگہ ناجائز ہے چاہے دار الاسلام ہو یا دار الحرب اور جن حضرات کے نزدیک یہ جائز ہے تو ہر جگہ جائز ہے دار الاسلام ہو یا دار الحرب، عہد صحابہ میں دار الاسلام میں عدم جواز اور دار الحرب میں جواز کی تفریق بالکل نہیں پائی جاتی۔

وقد روى سفيان عن حميد عن ميسرة قال سألت ابن عمر يكون لي على الرجل الدين الى اجل فاقول عجل لي واضع عنك فقال هو ربا وروى عن زيد بن ثابت ايضا النهي عن ذلك وهو قول سعيد بن جبير والشعبي وهو قول اصحابنا وعامة الفقهاء وقال ابن عباس وابراهيم النخعي لا باس بذلك

(احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص [illegible] مطبوعہ مصر)

سفیان نے حمید سے انھوں نے میسرہ سے روایت کی ہے انھوں نے کہا میں نے ابن عمر سے پوچھا میرا قرض کسی شخص کے ذمہ باقی ہو اور میں مدت پوری ہونے سے پہلے اس سے کہوں کہ قرض جلدی ادا کر دے میں کچھ کم کر دیتا ہوں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ ابن عمر نے جواب دیا یہ سود ہے۔ زید بن ثابت سے بھی ممانعت مروی ہے اور یہی سعید بن جبیر اور شعبی کا قول ہے اور یہی ہمارے اصحاب اور عام فقہا کا مذہب ہے اور ابن عباس اور ابراہیم نخعی نے کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس تصریح سے ظاہر ہے کہ وضع دین کے مسئلہ کا اختلاف دار الاسلام و دار الحرب کی بحث سے بالکل الگ ہے۔ امام نخعی جن کی تائید مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا پر پیش کی جاتی ہے وہ وضع دین کو دار الاسلام میں بھی جائز کہہ رہے ہیں تو پھر اس مختلف فیہ مسئلہ کو جس میں اختلاف دارین کا کوئی دخل نہیں مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا کی دلیل کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

(۲) استدلال کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ اجلا کے وقت بنی نضیر حربی تھے۔ راقم عرض کرتا ہے کہ وہ اجلا کے وقت حربی نہ تھے بلکہ مغلوب و مقہور دشمن تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر مصالحت کر لی تھی کہ ان لوگوں کو جلا وطن کر دیا جائے، اس لیے جانبین سے لڑائی بند ہو گئی تھی اور اللہ کے رسول نے ان کو امان دے دیا تھا اس مصالحت کا ذکر خود امام سرخسی اس مقام سے پہلے کر چکے ہیں۔ اگر کوئی سوال کرے کہ اس مصالحت کے بعد کسی مسلمان کے لیے یہ جائز تھا کہ ان پر حملہ کرے، ان کو قتل کرے یا ان کا مال لوٹ لے تو کیا اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے؟ نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ اسلامی حکومت ان کو جلا وطن ہو جانے کی شرط پر امان دے چکی تھی اس لیے اس وقت ان کی حیثیت مامون حربی کی تھی اور مامون حربی سے ربا کا معاملہ خود حنفیہ کے یہاں ناجائز ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ امام محمد رحمہ اللہ کی بیان کردہ یہ روایت

اس کے بجائے کہ امام اعظم کے مسلک کی مستدل بنے امام نخعی کی مستدل بن سکتی ہے جو اس جزئی معاملہ کو مسلمانوں کے درمیان بھی جائز کہتے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ مسلم و حربی کے درمیان جوازِ ربا کے لیے یہ روایت بھی کسی طرح دلیل نہیں بن سکتی۔

(۴) قال رحمه الله ذكر عن مكحول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا ربا بين المسلمين وبين الحربي في دار الحرب وهذا الحديث وان كان مرسلا فمكحول فقيه ثقة والمرسل من مثله مقبول وهو دليل لابي حنيفة ومحمد رحمهما الله في جواز بيع المسلم الدرهم بالدرهمين من الحربي في دار الحرب (مبسوط ج ۱۴ ص ۵۶)

مکحول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا دار الحرب میں مسلمانوں اور اہل حرب کے درمیان سود نہیں۔ یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے لیکن مکحول فقیہ اور ثقہ ہیں اور ان کے جیسے لوگوں کی حدیث مرسل مقبول ہے اور یہ حدیث ابو حنیفہ اور محمد رحمہما اللہ کی دلیل ہے اس مسئلہ میں کہ مسلمان کے لیے حربی سے دار الحرب میں ایک درہم کو دو درہموں کے بدلے میں بیچنا جائز ہے۔

تنہا ایک یہی حدیث ہے جو امام اعظم رحمہ اللہ کے مسلک کے لیے صحیح طور پر مستدل کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس دلیل کا ضعف اتنا بین ہے کہ اس پر کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ حدیث نہ صرف یہ کہ مرسل ہے بلکہ مجہول بھی ہے کیونکہ امام ابو حنیفہ اور مکحول کے درمیان کا راوی لامعلوم ہے۔

قال ابن الهمام قال في المغني هذا خبر مجهول لم يرو في صحيح ولا مسند ولا كتاب يوثق به وهو مع ذلك مرسل محتمل[1]

(۵) وحجتنا في ذلك ما روينا وما ذكر عن ابن عباس رضي الله عنه

اور ہماری دلیل اس میں وہ ہے جو ہم نے روایت کی (یعنی روایت مکحول) اور وہ جو حضرت عباس وغیرہ سے

[1] حاشیہ سعدی چلپی علی عنایہ شرح الہدایہ۔ یہ حوالہ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ کے مقالہ سے اخذ کیا گیا ہے جو معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔

قال فی خطبته کل ربا کان فی الجاهلیة فهو موضوع واول ربا یوضع ربا العباس بن عبد المطلب وهذا کان العباس رضی الله عنه بعد ما اسلم رجع الی مکة وکان یربی وکان یخفی فعله عن رسول الله صلی الله علیه وسلم فما لم ینهه عنه دل ان ذلك جائز وانما جعل الموضوع من ذلك ما لم یقبض حتی جاء الفتح وبه نقول وفیه نزل قوله تعالیٰ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا (مبسوط جلد ۱۴، صفحہ ۵۰)

مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں فرمایا: جاہلیت کا تمام سود باطل ہے اور سب سے پہلا سود جو باطل کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ اور یہ اس لئے کہ عباس رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے بعد مکہ واپس گئے اور وہ سود لیا کرتے تھے اور اپنا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپاتے تھے پس جب آپ نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا تو اس سے دلیل ملی کہ یہ جائز ہے آپ نے ان کے سود میں سے اس کو باطل کیا جس پر قبضہ نہ ہوا تھا یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا اور یہی ہم کہتے ہیں اور اسی معاملہ میں اللہ کا قول وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا نازل ہوا۔

حجۃ الوداع کے خطبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے جس سود کے اسقاط کا قانونی اعلان فرمایا وہ ان کے زمانہ جاہلیت وکفر کا سود تھا نہ کہ زمانۂ اسلام کا خود اس حدیث کے الفاظ اس کی تصریح کر رہے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اعلان وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا کو قانونی طور پر نافذ کرنا تھا اور تفسیر ابن جریر طبری وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ آیت حضرت عباس کے اس سود کے متعلق ہے جو ان کے اسلام سے پہلے کا تھا۔

وذکر الامام الزاهد قصة الآیة بتفصیل طویل وذکر انها علی روایة نزل فی شان عباس رضی الله عنه حیث ارتبی الناس فحین اسلم ارادان یرده فقیل له وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ فقال العباس انا

امام زاہد نے آیت کے قصے کو طویل تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ایک روایت کی بنا پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی چونکہ انھوں نے لوگوں سے سودی کاروبار کیا تھا جب اسلام لائے تو چاہا کہ سود ان لوگوں سے وصول کریں ان سے کہا گیا کہ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا اِنْ کُنْتُمْ

مومن وترك الربا۔ مُؤْمِنِيْنَ نازل ہوئی انھوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہوں اور
(اکلیل علی مدارک التنزیل) سود چھوڑ دیا۔

امام سرخسی نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بے ثبوت ہیں۔ اسلام لاکر حضرت عباس کا مکہ واپس جانا ثابت نہیں۔ اظہار اسلام اور تحریم ربا کے بعد ان کا مکہ میں سودی کاروبار کرنا قطعاً غلط ہے۔ امام سرخسی کا یہ کہنا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سود لیتے تھے اور اپنا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپاتے تھے ایک نہایت غلط بات ہے جو نادانستہ طور پر ان کی زبان سے نکل گئی ہے اگر امام سرخسی کو اس کا احساس ہوتا کہ ان کا یہ جملہ کان یخفی فعلہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس کو کس پوزیشن میں رکھ رہا ہے تو ان کی زبان سے ایسی بات نہ نکلتی اور لطف یہ ہے کہ اس جملے نے خود ان کے استدلال کو ختم کر دیا ہے کیونکہ ان کا رسول سے مخفی کرنا سود کے عدم جواز کو بتا رہا ہے نہ کہ جواز کو، باقی رہا یہ کہنا کہ "جب رسول نے ان کو اس سے منع نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ جائز تھا" یہ اس بات پر موقوف ہے کہ رسول کو اس کا علم بھی ہوا ہو اس لیے پہلے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا کہ حضرت عباس نے اسلام اور تحریم ربا کے بعد مکہ میں سودی کاروبار کیا اور آپ نے اس علم کے باوجود ان کو منع نہیں کیا لیکن یہ ایسی بات ہے جس کا قیامت تک ثبوت نہیں مل سکتا۔ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام اور حرمت ربا کی تاریخ پیش نظر نہ رہنے کی وجہ سے یہ ساری الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں اس لیے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ الجھن دور ہو۔

(۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام کی تاریخ کے اختلافات سے قطع نظر اتنا مسلم ہے کہ مکہ میں ان کا اسلام مخفی تھا اور وہاں وہ علانیہ مسلمان کی حیثیت سے مقیم نہ تھے بلکہ مشرکین ان کو اپنا آدمی سمجھتے تھے، انھوں نے فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی اور بالاعلان رسول کے دست حق پرست پر اسلام کی بیعت کی اور باضابطہ مہاجرین کی صف میں داخل ہوئے اس لیے ان کی اس مکی زندگی کے معاملات کو جو انھوں نے ہجرت سے پہلے گزاری جواز وعدم جواز کے لیے سند بنانا صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکہ میں اخفائے اسلام کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ورجع الی مکۃ فیقال انہ اسلم وکتم قومہ وصار یکتب الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالاخبار، ثم ھاجر قبل الفتح بقلیل (اصابہ ج ۲ ص ۲۳ مطبوعہ مصر)	اور وہ مکہ واپس گئے کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام لے آئے اور اپنے اسلام کو اپنی قوم سے چھپایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبریں لکھنے لگے پھر فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی۔

حافظ ابن عبدالبر استیعاب میں تحریر فرماتے ہیں:

قال ابو عمر اسلم العباس قبل فتح خیبر وکان یکتم اسلامہ، ثم اظھر اسلامہ یوم فتح مکۃ (استیعاب ج ۲ ص ۹۹ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد)	ابو عمر نے کہا عباس فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے اور اپنا اسلام چھپائے رہتے تھے پھر اپنا اسلام فتح مکہ کے دن ظاہر کیا۔

(۲) تحریم ربا کے متعلق گزشتہ صفحات میں لکھا جاچکا ہے کہ سود کس طرح بتدریج حرام ہوا ہے، ربا کی حرمت بھی اسی طرح بتدریج ہوئی ہے جس طرح شراب کی حرمت، ربا کی بالکلیہ اور مطلق حرمت اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۸ھ میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے سیرت النبی میں تحریر فرمایا ہے اور اس سلسلے کی آیت وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا بروایت طبری فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس پر تو غالباً سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں حرمت وحلت کے جو احکام نازل ہوئے ہیں ان میں حرمت ربا کی تفصیلی آیتیں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ اور ان کے نزول کی مدت ۸ھ اور اس کے بعد ہے۔ حرمت ربا کی جن آیتوں پر اس معاملہ کی مطلق اور بہمہ وجوہ حرمت کی بنیاد قائم ہے وہ اس سن میں نازل ہوئی ہیں جس میں حضرت عباس ہجرت فرما چکے ہیں، اس لیے بالفرض اگر مکہ میں ان کا کوئی سودی معاملہ ہو بھی تو وہ تحریم مطلق سے پہلے کا ہے۔

(۳) یہ بات کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو تحریم ربا کا علم حاصل ہوا ہو اور علم کے بعد انھوں نے سودی کاروبار کیا ہو اور شریعت کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ بغیر علم کے کوئی ذمہ داری نہیں۔ جو لوگ حضرت عباسؓ کے ربا کو مسلم وحربی کے درمیان جواز ربا کے لیے یا اس کے بدلے میں حاصل شدہ روپے کی حلت کے لیے دلیل بناتے ہیں ان کو ثابت کرنا چاہیے کہ وہ مکہ میں اسلام

کا اعلان کر چکے تھے اور یہ کہ ان کو حرمت ربا کی خبر مل گئی تھی اور اعلان اسلام و اطلاع حرمت کے باوجود انھوں نے یہ معاملہ کیا لیکن یہ باتیں کبھی بھی ثابت نہیں کی جا سکتی ہیں ؟ کلا ثم کلا۔

ان دلائل پر بحث کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ نصوص شرعیہ میں کوئی ایک واقعہ کوئی ایک بات کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جو اس مسئلہ میں مسلک حنفی کے لیے دلیل بن سکے۔ ان تمام استدلالات کو پڑھ کر دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یا للعجب وہ تمام اصول اور احتیاطیں جو فقہ حنفی کا طرۂ امتیاز ہیں وہ اس مسئلے میں کہاں رخصت ہو گئی ہیں۔

دوسرے خیال کی تنقید کتب ظاہر الروایہ میں دوسرا خیال جو یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلم و حربی کے درمیان عقد ربا تو باطل ہے لیکن حاصل شدہ مال طیب اور حلال ہے اس کے متعلق نہ کوئی نقلی دلیل پیش کی گئی ہے اور نہ موجود ہے اس کی بنیاد صرف عقل پر ہے، اس کی ساری بنیاد اس پر قائم ہے کہ حربی کا مال چونکہ غیر معصوم ہے اس لیے مسلم مستامن اس پر قبضہ کرنے کے بعد اس کا مالک ہو جاتا ہے اور وہ اس کے لیے حلال ہو جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ شریعت میں ایسی کوئی سند موجود نہیں کہ حرام ذریعہ سے حاصل کردہ مال کسی مسلمان کے لیے حلال ہو جائے، دیکھنا یہ ہے کہ اس خیال کی اصل کیا ہے ؟ دراصل اس کا ڈانڈا اموال غنیمت و فے کے حلال ہونے کی علت سے جا ملتا ہے۔ ہمارے فقہائے احناف رحمہم اللہ کے نزدیک اموال غنیمت و فے کے حلال ہونے کی علت ان کا غیر معصوم ہونا ہے ان کی عدم عصمت ہی علت حلت ہے اسی لیے امام اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ قیاس فرمایا ہے کہ جب الحربی کا مال لوٹ لینا اور چھین لینا درست ہے تو رضامندی سے ان کے اموال پر قبضہ کرنا بدرجہ اولی جائز ہوگا۔ مشرک کی لاش کو مشرکوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے جواز کا فتوی دیتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں :

ولو قتل المسلمون رجلا من المشرکین فاراد اهل الحرب ان یشتروه منهم فان ابا حنیفة قال لا باس بذلک الا تری ان اموالهم تحل للمسلمین ان	اگر مسلمانوں نے کسی مشرک کو قتل کر دیا اور اہل حرب نے چاہا کہ اس کی لاش کو خرید لیں تو ابو حنیفہ نے فرمایا کہ اس میں مضائقہ نہیں کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ ان کے اموال کو غصب کر لینا مسلمانوں کے لیے حلال ہے

خلفوہا بالغصب فاذا طابت انفسھم بھا فھو احل، واطیب	تو جب ان کے نفوس رضامند ہوں تو یہ مال زیادہ حلال اور اچھا ہوگا۔

یہاں راقم کے لیے ضروری ہے کہ اموال غنیمت فے کے حلال ہونے کی علت پر بحث کرے اور یہ دیکھے کہ اموال کی عدم عصمت کسی شرعی حکم کے لیے علت بن سکتی ہے یا نہیں؟

حلت غنیمت کی علت

غنیمت، فے اور بطور سلب ونہب حاصل کیے ہوئے اموال کی حلت کی علت کیا ہے؟ یعنی مشرکین محاربین سے جو اموال بطور غنیمت حاصل ہوتے ہیں یا بطور فے ان پر قبضہ کیا جاتا ہے یا لوٹ کر چھین کر تصرف میں لایا جاتا ہے تو یہ اموال مسلمانوں کے لیے کیوں حلال ہو جاتے ہیں؟

یہ بہت ہی اہم سوال ہے جس کو حل کر لینا ضروری ہے کیونکہ مسلم وحربی کے درمیان مسئلہ متنازعہ فیہ اور دیگر مسائل جزیہ کا جو طویل باب فقہ حنفی میں مرتب ہوا ہے اس کی بنیاد اسی علت پر ہے۔ ان اموال کے حلال ہونے کی علت ان کا غیر معصوم ہونا بتایا جاتا ہے یعنی یہ اموال مسلمانوں کے لیے اس لیے حلال ہو جاتے ہیں کہ یہ غیر معصوم ہیں ان کی عدم عصمت ہی ان کی حلت کی اصل علت ہے۔ اس اجتہادی علت کو اصل بنا کر ہمارے ائمہ نے اس پر سیکڑوں مسائل متفرع فرمائے ہیں اور یہ اجتہادی علت ان کے اذہان عالیہ پر اس قدر غلبہ پائے ہوئی تھی کہ جیسے یہ بھی کوئی نص قطعی ہے۔ مسلم وحربی کے درمیان مسائل متفرعہ کا پورا باب پڑھ جایئے بکثرت یہی علت کام کرتی ہوئی نظر آئے گی اور حد تو یہ ہے کہ جو چیزیں نصوص قطعیہ سے حرام وناجائز تھیں وہ اس اجتہادی علت کی وجہ سے مشروط ومقید ہو گئی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارے فقہائے نے جو یہ علت بیان فرمائی ہے اس کی بنیاد کیا ہے۔ جہاں تک راقم الحروف سمجھ سکا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ انھوں نے بعض احادیث کو سامنے رکھ کر اموال کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ معصوم اور غیر معصوم۔ چونکہ غنیمت وفے کا تعلق اموال غیر معصوم سے ہے اس لیے انھوں نے ان اموال کے غیر معصوم ہونے ہی کو حلت کی علت قرار دیا ہے۔ جس حدیث سے یہ تقسیم نکالی جاتی ہے وہ یہ ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے مقاتلہ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے

ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ (بخاری شریف)

رسول ہیں اور یہ کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں پس جب وہ یہ کرلیں تو انھوں نے مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا مگر بحق اسلام اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

یہ حدیث بالفاظ مختلف صحاح میں آئی ہے لیکن سب کا مفہوم اور حاصل ایک ہے اس حدیث سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہ تعلیم فرما رہے ہیں کہ ہماری لڑائی غیر مسلموں سے کسی ذاتی عناد یا حصول مال کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ اللہ کے باغی ہیں جیسے ہی کہ وہ اس بغاوت سے باز آکر مسلم بن جائیں گے ہماری لڑائی ان سے بند ہو جائے گی اب ہم نہ ان سے مقاتلہ کریں گے اور نہ ان کے اموال پر قبضہ کریں گے، ان کے نفوس و اموال حق اسلام کے عوض محفوظ ہو جائیں گے، نیز یہ کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے یہ مقاتلہ و جہاد تا قیامت جاری رہے گا یہی مقصد ہے اس ارشاد نبوی کا ورنہ ظاہر ہے یہ حدیث نہ تو قتال و عدم قتال کی تمام صورتوں کو بیان کرتی ہے اور نہ اس سے نفوس و اموال کی کوئی ایسی تقسیم نکلتی ہے جو احکام شرعیہ میں کسی طرح کا دخل رکھتی ہو۔ الا بحق الاسلام کا ٹکڑا صاف بتا رہا ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی نفوس و اموال مطلقاً معصوم نہ ہوں گے بلکہ یہ عصمت اس وقت تک رہے گی جب تک ایک مسلمان خدا و رسول کا پورا پورا فرمانبردار بنا ہوا ہے ورنہ جیسے ہی کہ اطاعت سے قدم باہر نکال کر فساد انگیزی کرے گا اس کی جان اور مال دونوں ہی شریعت کی نظر میں غیر معصوم ہو جائیں گے اور جان کے بدلے میں اس کی جان، و مال کے بدلے میں اس کا مال لے لیا جائے گا اسی طرح اس حدیث سے اشاتاً بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن غیر مسلموں سے مسلمانوں کی لڑائی ہے ان کے نفوس و اموال ایسے غیر معصوم ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرح ان میں تصرف کا حق ہے بلکہ خدا و رسول نے ان کے نفوس و اموال میں تصرف کے حدود متعین کر دیے ہیں اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ان حدود سے باہر قدم نکالے اس حدیث سے بطور مفہوم مخالف جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ الحربی کے نفوس و اموال محفوظ نہیں ہیں، ان کو قتل کیا جا سکتا ہے اور ان کے اموال کو بجبر قبضے میں لایا جا سکتا ہے لیکن ان اموال

کے حلال ہونے کی علت کیا ہے اس کے لیے اس حدیث میں کوئی اشارہ موجود نہیں بلکہ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الحربی کے نفوس و اموال کی عدم عصمت کسی حکم کی علت نہیں بلکہ ان کے شرک و بغاوت کی خود معلول ہے۔ اس بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اموال و غنیمت و فے کے حلال ہونے کی علت ان کا غیر معصوم ہونا نہیں ہے شریعت اسلامیہ میں کہیں کسی حکم کے لیے نفوس و اموال کا معصوم یا غیر معصوم ہونا اصل اور علت کی حیثیت نہیں رکھتا۔

مال غنیمت وغیر کی علت کی اصل علت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اموال غنیمت و فے کے حلال ہونے کی ان کا غیر معصوم ہونا نہیں ہے تو پھر آخر اس کی علت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مال غنیمت وغیرہ کے حلال ہونے کی اصل علت اس کائنات کے مالک حقیقی اللہ رب العالمین کا حکم اور اس کی اجازت ہے اللہ کی اجازت ہی نے غنیمت کو حلال کیا ہے اگر اس کی اجازت نہ ہوتی تو قیامت تک کسی مسلمان کے لیے غنیمت حلال نہ ہوتی یہ کوئی قیاسی اور اجتہادی بات نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کی نص صریح اس پر دلالت کر رہی ہے

لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا

اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال و طیب ہے۔

یہ آیت کریمہ تصریح کے ساتھ بتا رہی ہے کہ مال غنیمت و فدیہ کے حلال ہونے کی وجہ ان کا غیر معصوم ہونا نہیں ہے کیونکہ اگر ان کا غیر معصوم ہونا ہی علت حلت ہوتا تو اخذ پر عذاب کی دھمکی کیوں دی جاتی اور پھر فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا کے امر صریح کی ضرورت ہی کیا پڑتی یہ آیت روز روشن کی طرح یہ بتا رہی ہے کہ مال غنیمت کی اصل علت فکلوا کا امر ربانی ہے نہ کہ اس کی عدم عصمت۔ مال غنیمت امت محمدیہ سے پہلے تمام دیگر انبیاء اور ان کی امتوں پر حرام تھا اور یہ پہلی آیت ہے جس نے اس کو حلال کیا اگر اس کے حلال ہونے کی علت اس کی عدم عصمت ہی ہوتی تو پھر اس پر قبضہ کرنے کے باوجود تمام امتوں پر وہ حرام کیوں ہوتا اور عتاب کے بعد اس امت پر حلال کرنے کے لیے صریح امر و اجازت نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگلی امتوں پر غنیمت کی حرمت اور اس امت پر اس کی علت کا پورا بیان بخاری شریف کی

کتاب فرض الخمس میں موجود ہے۔ اس طویل حدیث کے آخر میں ہے۔

ثم احل الله لنا الغنايم راى ضعفنا — پھر اس نے غنیمتوں کو ہمارے لیے حلال کر دیا اس نے

وعجزنا فاحلها لنا — ہمارے ضعف و عجز کو دیکھا تو ہمارے لیے حلال کر دیا۔

حدیث کا یہ ٹکڑا عدم عصمت کے علت ہونے کو اتنی وضاحت سے ثابت کر رہا ہے کہ اس سے زیادہ وضاحت ممکن نہیں اس حدیث میں تو شارع علیہ السلام صاف صاف بیان فرما رہے ہیں کہ اس امت کے ضعف عجز کو دیکھتے ہوئے اللہ نے اپنی رحمت سے غنیمت کو ہمارے لیے حلال کر دیا، اگر مال غنیمت کے حلال ہونے کی علت اس کا غیر معصوم ہونا ہے تو پھر اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے؟ اس آیت کریمہ اور اس حدیث شریف نے جو وضاحت یہ بات بتائی کہ مال غنیمت کے حلال ہونے کی علت مالک حقیقی رب العالمین کی اجازت ہے اور اس اجازت کی علت امت محمدیہ کا ضعف و عجز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کا مال کسی دوسرے کے لیے حلال ہوتا ہی اس وقت ہے جب اس کے مالک کی اجازت و رضا حاصل ہو۔ بیع و فروخت ہو یا صدقہ و ہبہ، وراثت ہو یا وصیت چاہے جس ذریعہ سے بھی کوئی کسی کے مال کا مالک ہو ہر جگہ اس کے مالک کی اجازت حلت کی اصل علت بنی ہوئی ہے اور ان تمام اجازتوں کی تہ میں اصل اجازت مالک حقیقی کی شامل ہے یہی وجہ ہے کہ جب اس کی اجازت موجود نہیں ہوتی تو بعض موقعوں پر مالک مجازی کی اجازت کے باوجود مسلمان کے لیے اس کا مال حلال نہیں ہوتا۔ غنیمت و فے میں چونکہ ان اموال کے مالکوں کی اجازت و رضا حاصل نہیں ہوتی اس لیے سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ یہاں حلت کی کوئی اور علت ہے حالانکہ یہاں بھی مالکوں کے مالک کی اجازت و رضا حاصل ہے اور دراصل یہی اجازت و رضا ان اموال کو حلال کر رہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے غلاموں کو قسم قسم کی نعمتیں اور طرح طرح کے اموال اس شرط پر استعمال کرنے کے لیے دے کہ ہماری اطاعت کرتے رہنا اور ہمارے حقوق نہ بھولنا، کچھ دنوں کے بعد ان میں سے چند اپنے آقا سے بغاوت کریں اور تمام عہد و پیمان توڑ ڈالیں، اس کے بعد آقا اپنے فرمانبردار غلاموں کو حکم دے کہ جاؤ ان سرکشوں کی سزا کرو اور ان کے اموال ان سے چھین لو اور اپنے تصرف میں لاؤ تو اب اصل مالک کی اجازت و رضا کے بعد ان سرکش غلاموں کی اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب غور طلب یہ بات ہے کہ ان اموال میں خود کوئی ایسی صفت ہے جس نے دوسروں کے لیے ان کو حلال کر دیا ہے یا آقا کی اجازت اس کی اصل علت ہے

ظاہر ہے کہ آقا کی اجازت اصل علت ہے اس مال کی کوئی صفت علت علت نہیں۔

فقہ حنفی کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ کفار اگر مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کرلیں اور دار الاسلام سے نکل کر اپنے گھر پہنچ جائیں تو وہ ان کے مالک ہوجاتے ہیں لیکن اگر کفار آزاد مسلمانوں کو قید کرکے دار الحرب میں داخل ہوجائیں تو وہ ان کے مالک نہیں ہوتے اور آزاد مسلمان بہر حال آزاد ہی رہتے ہیں لیکن مسلمان اگر آزاد حربیوں کو گرفتار کرلیں تو وہ ان کافروں کے مالک ہوجاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ بتاتے ہوئے امام سرخسی لکھتے ہیں:

وذلك في تملك رقاب الاحرار لان الآدمي في الاصل خلق مالكا لا مملوكا فصفة المملوكية فيه تكون بواسطة ابطال صفة المالكية وذلك مشروع في حقهم بطريق الجزاء فانهم لما انكروا وحدانية الله تعالى جازاهم الله تعالى على ذلك بان جعلهم عبيد عبيده

اور وہ آزاد لوگوں کے مالک ہونے میں ہے اس لیے کہ آدمی اصل میں مالک پیدا کیا گیا ہے نہ مملوک پس اس میں مملوکیت کی صفت مالکیت کی صفت کو باطل کردینے کے ذریعہ ہوتی ہے اور یہ کفار کے حق میں بہ طریق جزا مشروع ہے اس لیے کہ انھوں نے جب اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا تو اللہ نے ان کو اس کا بدلہ اس طرح دیا کہ ان کو اپنے غلاموں کا غلام بنا دیا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام سرخسی رحمہ اللہ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ ٹھیک وہی بات ہے جو راقم نے غنیمت و فے میں بیان کی ہے یعنی یہی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے سرکش و باغی غلاموں کو بہ طریق جزا اپنے فرمانبردار غلاموں کا غلام بنا دیا ہے اور اللہ کا "جعل" جواز مملوکیت کفار کی علت ہے اسی طرح اللہ نے بطریق جزا اپنے سرکش غلاموں کے اموال اپنے فرمانبردار غلاموں کے لیے حلال کردیے ہیں اور اللہ کا "اذن" حلت غنیمت و فے کی اصل علت ہے۔

نتیجۂ بحث اس بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ الحربی کے اموال مسلمانوں کے لیے اس لیے حلال نہیں ہیں کہ وہ غیر معصوم ہیں بلکہ اس لیے مباح اور حلال ہیں کہ اللہ کے امر نے ان میں اباحت اور حلت پیدا کردی ہے اس لیے کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان کے اموال پر قبضہ و تصرف اللہ اور اللہ کے رسول کے اوامر

واحکام کے ماتحت کرنا صحیح ہوگا۔ کسی ایسے طریقے سے اس پر قبضہ کرنا صحیح نہ ہوگا جس کی اجازت خدا و رسول نے نہ دی ہو، خدا اور رسول نے کتاب و سنت میں کہیں بھی اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ حربیوں کے اموال ایسے ذرائع سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں جن کو انھوں نے خود بلا تخصیص و تقیید حرام قرار دیا ہے۔ دین اسلام نے حربیوں کے اموال حاصل کرنے کے دو طریقے بتائے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوٹ کر، چھین کر، ان کو قتل کرکے، جلاوطن کرکے ان کے اموال پر قبضہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ حربیوں کے ساتھ خاص ہے اور یہ سزا ہے ان کے شرک و سرکشی کی، کفر و بغاوت کی۔ دوسرا بیع و شرا اور عقود و معاملات کا ہے۔ تملک و تملیک کا یہ طریقہ عام ہے۔ اس میں حربیوں کی کوئی خصوصیت نہیں اور یہی وہ طریقہ ہے جس میں طرح طرح کے فسادات اور بطالتیں ہوتی ہیں۔ دین اسلام نے عقود و معاملات کے ان تمام فسادات کو سختی کے ساتھ روکا ہے جو معلوم نہیں کب سے دنیا پر مسلط تھے اور جنھوں نے دنیا کو امن و سکون سے محروم کر رکھا تھا۔ بیع و شرا اور عقود و معاملات کے طریقہ تملیک و تملک میں مسلمان اور حربی کا کوئی فرق نہیں۔ کسی عقد فاسد یا باطل سے جس طرح کسی مسلمان کے مال پر قبضہ کرنا جائز نہیں اسی طرح کسی حربی کے مال پر قبضہ کرنا بھی درست نہیں۔ دس روپے کے بدلے میں بیس روپے اگر کسی مسلمان سے لینا جائز نہیں تو بلا فرق کسی حربی سے لینا بھی جائز نہیں۔ دین اسلام نے اموال کی کوئی ایسی تقسیم نہیں کی ہے کہ ایک ہی قسم کے الفاظ ادا کرکے کسی ایک مال پر قبضہ کرنا حرام ہو اور بعینہ وہی الفاظ ادا کرکے کسی دوسرے مال پر قبضہ کرنا حلال ہو۔ عقل اور قیاس کے سوا کسی طرح بھی اس قسم کی دوعملی کا ثبوت نہیں بہم پہنچایا جاسکتا۔

خاتمہ کلام قرآن کریم، احادیث نبویہ اور آثار صحابہ کی روشنی میں یہ مسئلہ بالکل محقق ہوگیا کہ سود کی حرمت مطلق اور غیر مشروط ہے۔ دس کے بدلے میں بیس روپے حاصل کرنا قرض کی صورت میں ہو یا نقد کی صورت میں، حربی سے بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح مسلمان سے۔ فقہ حنفی کی چھان بین کرنے سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کے مسلک کی بنیاد اس مسئلے میں صرف قیاس اور اجتہاد پر ہے اور جہاں پر نصوص اور قیاس و اجتہاد کا مقابلہ ہو وہاں پر ہمیں فقہ حنفی ہی یہ بتاتی ہے کہ قیاس و اجتہاد کو ترک کر دیا جائے۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)